جلد02 شمارہ16، 2023

*Article*

# The depiction of Lucknow civilization in Novel Char Dewari by Shoukat Saddique

# ناول "چار دیواری" از شوکت صدیقی میں لکھنوی تہذیب کی عکاسی

**Dr. Imran Zafar*[1], Dr. Muhammad Kamran Shahzad[2]**

[1] Chairman, Department of Urdu, Govt. Graduate College, Jhang

[2] Visiting Lecturer, Department of Urdu, University of Sargodha

*Correspondence: raiimranzafar@gmail.com

**ڈاکٹر عمران ظفر[1]، ڈاکٹر محمد کامران شہزاد[2]**

[1] چیئرمین شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج، جھنگ، [2] وزٹنگ لیکچرار، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا

**Abstract:** Shaukat Siddiqui's third novel "Char Dewari" is worthy of study in the context of the reflection of Lucknow civilization. Shaukat Siddiqui has described the society and civilization of Lucknow in detail in this novel. The novelist has described the superstitions in Lucknow culture, food and drink, sports spectacles, color relays, prostitutes' dens and the customs and traditions of marriages and other ceremonies in Lucknow, and also described the social status quo.

**Keywords**: Shaukat Siddiqui, Char Dewari, Lucknow, Civilization, Culture, Customs, Marriage, Social Status, Literature,

**eISSN**: 2073-3674
**pISSN**: 1991-7813
Received:05-09-2023
Accepted:29-11-2023
Online:20-12-2023

**Copyright:** © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

شوکت صدیقی کا شمار بیسویں صدی کے نمایندہ اردو ناول نویسوں میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں سماج کی اجتماعی خرابیوں اور کوتاہ بینیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوی تخلیقات میں ترقی پسندانہ خیالات کو بھی کامیابی سے پیش کیا۔ انھوں نے اردو ناول میں سماجی حقیقت نگاری کی روایات کو نئی وسعت عطا کی۔ ان کا طبقاتی شعور اور انسان دوستی کا تصور منفرد حیثیت رکھتا ہے جو انہیں معاصر ناول نویسوں میں امتیاز بخشتا ہے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اردو ادب کے نامور فکشن نگار شوکت صدیقی کا تعلق لکھنو سے تھا۔ ان کے آباؤ اجداد بھارتی ریاست اتر پردیش کے ضلع بریلی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر انوار احمد اپنے خیالات یوں پیش کرتے ہیں :

> "اردو فکشن کے سب سے سینئر اور مقبول تخلیق کار شوکت صدیقی ۰۲ مارچ ۳۲۹۱ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق روہیل کھنڈ، یوپی کے ضلع بریلی سے تھا۔ "(1)

شوکت صدیقی نے تین ناول خدا کی بستی، جانگلوس (تین جلدیں) اور چار دیواری تخلیق کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کمین گاہ اور کوکا بیلی کے عنوان سے ناولٹ بھی لکھے۔ یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ ان کا ناولٹ بعنوان "کوکا بیلی" لکھنوی طرزِ معاشرت کو موضوع بنائے ہوئے ہے جس کو بعد میں وسعت دے کر انھوں نے ناول کی صورت میں شائع کیا۔

لکھنوی تہذیب و تمدن کی عکاسی کے تناظر میں شوکت صدیقی کا تیسرا ناول "چار دیواری" لائقِ مطالعہ ہے۔ اس ناول میں انھوں نے داستان سرائی، الف لیلیٰ کی فضا اور حیرت انگیز واقعات کو بیان کیا ہے۔ تحیر، تجسس، جذبوں کی سرگوشی اور اسراریت کا ایک ایسا طلسم ہے جو پورے ناول پر چھایا ہوا ہے۔ یہ ناول چونکہ پہلے رسالہ "ڈائجسٹ" میں قسط وار شائع ہوتا رہا، اس لیے ناول نویس نے قاری کے تجسس کو برقرار رکھنے کے لیے داستانوی رنگ کو کامیابی سے پیش کیا ہے۔ یہ ناول لکھنو کے خود فریب معاشرے کی کہانی ہے جس میں خواتین کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر ہے اور گھروں کی چار دیواری میں مقید، تعلیم و تربیت سے کوسوں دور وہ اپنے سایے سے بھی خوف زدہ دکھائی دیتی ہیں اور رسوم و رواج کے بے رحم شکنجوں میں یوں جکڑی تھیں کہ انھیں زمانے کے طور اطوار کی کوئی خبر نہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بھوت پریت اور آسیب انسانوں بالخصوص عورتوں کے اعصاب پر سوار تھے۔ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی کونہ کھدرا یا منزل نادیدہ قوتوں کا مسکن

تصور کی جاتی تھی۔ دن ڈھلتے ہی عورتیں اور بچے اپنے ہی گھروں کے صحنوں میں دبک جاتے تھے اور کہانیاں کہنے والے انتہائی ڈراؤنی کہانیاں سنا کر سب کو خوف زدہ کر دیتے تھے۔

"چار دیواری" میں ایک ایسی ہی حویلی کا ذکر ہے جس کے مکین شام ڈھلتے ہی سمجھتے تھے کہ اب جنات اور ارواح کے پھیرے شروع ہو چکے ہیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ حویلی کے مالک نواب تقی کا قتل ہو گیا جس کا اصل محرک زمین جائیداد کے جھگڑے تھے مگر مشہور یہ ہوا کہ نواب صاحب کا قتل جنات کی کاروائی ہے :

"نواب تقی جو اپنے سوتیلے بھائی نواب صفی سے جائیداد کے جھگڑوں اور مقدمے بازیوں میں الجھے ہوئے تھے، انھیں ایک رات کسی نے گلا دبا کر مارنے کی کوشش کی۔ بمشکل وہ جان بچا پائے۔ گھپ اندھیرے میں انھیں لگا کہ کوئی کھڑکی سے کودا ہے۔ انھوں نے جا کر دیکھا تو سامنے قبرستان کے قریب سفید کفن پوش دکھائی دیا۔ اگلی صبح قبرستان کا جائزہ لیا گیا تو ایک قبر کا منہ کھلا نظر آیا۔ ہر طرف اس آسیبی واردات کا تذکرہ پھیل گیا۔ درگاہوں پر نذرانے دیئے گئے۔ کالے بکرے صدقہ کیئے گئے اور طرح طرح کی رسوم ادا کی گئیں اور پھر یہ مشہور ہو گیا کہ کوئی مردہ قبر سے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اب اس کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔"(2)

اس ناول کے نمایاں کرداروں میں طلعت آرا، گلفام، قیصر مرزا، نواب تقی، نواب صفی، مس ایملی، رمضانہ، خسرو، مولوی صاحب، بادشاہ غازی الدین حیدر وغیرہ نمایاں شامل ہیں۔ چونکہ ہر بڑا ناول اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حال کی دنیا کی معنویت بھی متعین کرتا جاتا ہے۔ شوکت صدیقی بھی چار دیواری کے حوالے سے ہمیں ایک خاص عہد میں لے جاتے ہیں، ایک شہر، ایک تہذیب، ایک خاص معاشرے کی تصویر دکھاتے ہوئے بنیادی انسانی جذبوں، وسوسوں اور اندیشوں اور آرزوؤں اور زندگی میں تغیر کی ناگزیری کو تاریخی شعور بنا کر پیش کرتا ہے۔

شوکت صدیقی نے اس ناول میں لکھنؤ کی معاشرت اور تہذیب کو مفصل طور سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھنوی معاشرے میں توہم پرستی کو کھل کر بیان کیا ہے۔ ناول نویس نے جس عہد کے لکھنوی سماج کے احوال کی تصویر کشی کی ہے، اس دور میں ضعیف الاعتقادی لکھنوی معاشرے میں عام تھی۔ منگل کے دن کو منحوس خیال کرنا، کالی بلی کا رستہ کاٹنا، تعویذ گنڈوں پر حد درجہ اعتقاد، الو اور دیگر پرندوں کی نحوست وغیرہ لکھنوی معاشرت میں بکثرت دکھائی دیتا ہے۔ مذکورہ ناول میں لکھنوی تہذیب میں توہم پرستی کے تناظر میں رضوانہ سید علی اپنے خیالات یوں پیش کرتی ہیں:

> ”توہم پرستی کی رسومات بھی ناول میں خوب بیان کی گئی ہیں بچوں کی پیدائش کے موقع پہ توے، پھکنیاں اور چمٹے بجابجا کر بھوت پریت اورارواح کو بھگایا جاتا۔ سال میں ایک بار گڑیوں کا تہوار آتا۔ تب حلوے زردے بنتے اور چوراہوں پہ گڑیاں رکھ کر ان کی پٹائی کی جاتی۔ اس طرح بلائیں دفع کی جاتیں۔ محرم میں دریائے گومتی میں حلوے اور عریضے بہائے جاتے۔ قدم قدم حاضرات کی محفلیں، قوالیاں، عرس اور درویشی رقص جاری تھے۔ کیا امیر کیا غریب سبھی خواہشات کے غلام اور توہم پرستی کے اسیر تھے۔“(3)

اس ناول میں لکھنوی تہذیب میں توہم پرستی کے کئی واقعات کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے، جن کو مکمل طور پر بیان کرنا مقالے کو طول دینے کے مترادف ہوگا۔ چند واقعات کا ذکر لکھنوی معاشرت میں توہم پرستی کو اجاگر کرنے کے لیے بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ناول میں مرکزی حویلی کے نواب تقی خان کے قتل کے اصل حقائق اور اسباب و محرکات کو جاننے کے بجائے صرف اور صرف اسے جنات کی کارستانی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح نواب زادہ جعلی عامل قلزم شاہ کی نصیحت پر چلہ کشی کرنے لگتا ہے۔ قلزم شاہ اپنے لکھنوی متعقد نواب زادے کو قیمتی خزانے کا لالچ دیتا ہے اور اسے چلا کشی پر اکساتا ہے۔ حویلی کے ساتھ ویران کھنڈر نما مکان میں نواب زادہ چالیس دن کا چلا کاٹ کر قیمتی خزینہ ہتھیانے کے منصوبے پر عمل کرتا ہے مگر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے ناول کا درج ذیل اقتباس لکھنوی معاشرت میں توہم پرستی اور جعلی عاملوں کے عمل دخل کو بے نقاب کرتا ہے:

> ”قلزم شاہ وضع قطع سے صوفی نظر آتے تھے۔ گھنی سیاہ داڑھی، آنکھوں میں سرمہ، ہونٹوں پر پان کا لاکھا، سر پر سبز ریشمی عمامہ جس کے نیچے لمبی لمبی گھونگر والی زلفیں

لہراتیں۔ باقاعدہ پیری مریدی کرتے تھے۔ ہفتوں اعتکاف میں بیٹھے رہتے، چلا کشی کرتے، جنوں کو قابو میں کرتے، گنڈے تعویذ دیتے، جھاڑ پھونک کرتے۔ عقیدت مندوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔"(4)

اس کے علاوہ بھی کئی واقعات سے ناول میں لکھنوی معاشرت میں ضعیف الاعتقادی کا ذکر ملتا ہے۔ اس حوالے سے ناول میں مغلانی کا کردار لائقِ توجہ ہے جو ظاہری طور پر پارسا لیکن درپردہ ایک نواب زادے کے ساتھ معاشقے میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔ وہ دن میں تو سادہ سا حلیہ بنائے رکھتی لیکن رات کو خوب بن ٹھن کر نواب زادے سے ملتی۔ ایک رات نواب بیگم نے ضرورت سے مغلانی کو آوازیں دیں۔ جواب نہ ملنے پر وہ خود اس کے کمرے میں آئیں۔ آہٹ پا کر لڑکا پلنگ کے نیچے چھپ گیا اور مغلانی گہری نیند سونے کی اداکاری کرنے لگی۔ نواب بیگم اس کا شاہانہ لباس اور بناؤ سنگھار دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ اگلے روز مغلانی سادہ سے لباس میں سامنے آئی تو بیگم نے رات کا احوال پوچھا۔ وہ بھولپن سے بولی کہ وہ تو رات کو انھی کپڑوں میں تھی۔ بیگم صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ کسی اوپری اثر میں ہے، لہذا سب کو منع کر دیا کہ رات کو خواہ کتنی بھی ضرورت ہو کوئی اس کی کوٹھڑی میں نہ جائے۔ سب اس سے خوف کھانے لگے اور اسے کھلی چھٹی مل گئی۔

ناول کے آخر میں طلعت آرا جو ناول کی مرکزی نسوانی کردار ہے، ایک بار پھر نمودار ہوتی ہے۔ جہالت، اوہام پرستی اور گھٹن زدہ ماحول نے اس کی زندگی برباد کر دی ہے۔ جس اوباش نواب زادے نے اسے تباہ کیا تھا، وہ کسی نہ کسی طرح کھوج لگا کر ایک مرتبہ پھر اس کی خواب گاہ تک پہنچ گیا اور اسے کہانی سنانے لگا کہ اسے جنوں کی دنیا میں شہنشاہِ جنات نے قید کر لیا تھا مگر وہ وہاں بھی اپنی دل ربا طلعت آرا کی یاد میں تڑپتا رہا ہے اور آخر کار وہ دوبارہ اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس حوالے سے ناول کا درج ذیل اقتباس قاری کو لکھنوی معاشرت میں ایہام پرستی کے بارے میں آگاہی دیتا ہے:

"بہت دنوں سے تمہاری یاد ستا رہی تھی۔ قیصر مرزا نے گہری سانس بھری۔ آج کچھ ویسا ہی دل بے قرار ہوا کہ محفل میں دل نہ لگا۔ سبز پری ناچ رہی تھی۔ اس کا ناچ مجھے پسند بھی ہے۔ آج تو اس پر اس غضب کا نکھار تھا کہ میں تم سے کیا بیان کروں۔ ظالم ہے بھی ایسی خوبصورت کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ وہ ان پرانے مکالموں کو دہرانے لگا جو کبھی آغا جانی نے اسے رٹائے تھے اور ان کو برمحل ادا کرنے کی باقاعدہ تربیت بھی دی

تھی۔ مگر تمہاری یاد کچھ اس طرح رہ رہ کر آئی کہ طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ نہ ناچ اچھا لگا نہ گانا۔"(5)

ناول میں لکھنوی معاشرت میں عیش و عشرت اور زوال پزیر معاشرت کو بھی وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ شوکت صدیقی نے لکھنو کے زوال پزیر معاشرے کی یوں عکاسی کی ہے کہ اس کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ یہاں فلاکت زدہ نواب کھنڈر حویلیوں میں عسرت کی زندگی گزارتے دکھائی دیتے ہیں مگر ہاتھ پاؤں ہلانے کو تیار نہیں۔ ساری عمر عیش و عشرت کرنے والی بیگمات پیٹ بھرنے کے لیے جسم فروشی کے سوا کچھ نہیں کر سکتیں۔ طوائفوں کا راج ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ طوائفوں کے ناچ گانے، خانقاہی نظام اور لکھنوی معاشرت میں عیش و عشرت کے تناظر میں ناول کا درج ذیل اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

"شاہ منیا کے مزار پر عام حاضرین کے ساتھ طوائفیں بھی بصورت جلوس آتیں۔ گا کر چڑھاتیں۔ یہ پورے بناؤ سنگھار میں ہوتیں۔ آگے آگے شہنائی بجتی، صندل کی چوکی پہ چاندی کی گاگر، جس میں گلاب کی پتیوں سے لبریز پاک صاف پانی ہوتا، ساتھ میں ٹوکروں مٹھائی، ہار پھول اور روپوں کے نذرانے ہوتے۔ مزار سے تبرکات حاصل کیے جاتے، مریضوں کو شفا کے لیے خاک چٹائی جاتی۔ قوال لہک لہک کر قوالی گاتے اور سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا۔"(6)

مندرجہ بالا اقتباس میں انھوں نے لکھنوی تہذیب و تمدن میں طوائفوں کی رنگ رلیاں، موج مستی، خانقاہی نظام سے جڑی اشیا اور لکھنوی تہذیب میں عشرت پسندی اور اس کے متعلقات کو تفصیلی طور سے بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے لکھنوی لباس اور لکھنوی کھانوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھنو میں پان خوری اور مے نوشی کا ذکر بھی ناول میں بار بار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے لکھنو میں امرا اور نواب زادوں کے کھیل تماشوں کا ذکر بھی تفصیلی طور سے کیا ہے۔ جن میں تیتر اور بٹیر کے مابین مقابلے، تماش بینی، شطرنج کھیلنا، تاش کے پتوں سے مختلف کھیل کھیلنا اور کنکوے اڑانا شامل ہیں۔ ذیل میں لکھنوی تہذیب کی عکاسی کے لیے بٹیر پالنے اور بٹیر سے جڑے کھیلوں کو ناول نگار نے ان الفاظ میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے:

"یہ خاص مجرب نسخہ بٹیر کے پنجوں کے ناخن تیز اور نوک دار بنانے کے لیے تھا۔ کوئی رات کے سناٹے میں بٹیر کے کانوں میں کوک دیتا تھا۔ ایک طبیب بٹیروں کے علاج معالجے کے لیے مستقل ملازم تھا۔ غرض یہ کہ بٹیروں کے ہر طرح سے ناز نخرے اڑائے جاتے۔ پالی میں لڑانے کے لیے انہیں ہر طرح تیار کیا جاتا۔ جھپٹنے، جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر زیادہ قوت سے جھپٹنے کے ہر گُر اور ہر حربے کی تربیت دی جاتی تھی۔ نواب صفی بٹیروں کی پالی میں بہ نفس نفیس شریک ہوتے تھے اور اس شان سے ہوتے تھے کہ جلو میں مصاحبین کا غول ہوتا۔ ایک ایک بٹیر پر ہزاروں کی شرط لگاتے لیکن قسمت کے ایسے ہیٹے تھے کہ ہمیشہ ہارتے تھے، کبھی اتفاق سے جیت جاتے تو فتح و کامرانی کا جشن اس قدر دھوم دھام سے مناتے کہ جیت کی رقم سے دگنا خرچ ہو جاتا۔"(7)

علاوہ ازیں ناول میں طوائفوں کو گھر میں بٹھالینا اور ان کے مشاغل پورے کرنا بھی لکھنوی تہذیب کے خاص رنگ کے طور پر قاری کے سامنے رکھا گیا ہے۔ پتنگ بازی بھی لکھنو کا ایک مقبول کھیل ہے جو انیسویں صدی میں بھی لکھنوی تہذیب کا جزوِ خاص تھا۔ اس حوالے سے ناول نگاریوں گویا ہوتے ہیں:

"ادھر شہر میں منہ اندھیرے جلی خورشید کی کنکوے کی سرسراہٹ سے آنکھ کھلتی۔ وہ کھاتی پیتی، بڑے کلے ٹھلے کی ڈیرے دار طوائف تھی۔ گانے میں اس کا جواب نہ تھا، نور کا گلا پایا تھا، رقص میں بھی دسترس رکھتی تھی۔ ناچ گانے کے ساتھ ساتھ کنکوے بازی کا بھی شوق تھا اور والہانہ حد تک تھا۔ سنا ہے ایک زمانے میں گھڑ سواری بھی کرتی تھی۔ نہایت آن بان سے گھوڑے کو ایڑ لگا کر دوڑاتی تھی۔ سائیکل بھی چلاتی تھی اور بہت تیز چلاتی تھی لیکن اب لکھنو کے ایک رئیس ٹھاکر نواب علی کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ نام بھی کبرا بیگم رکھ لیا تھا۔ گھڑ سواری اور سائیکل سواری تو چھوٹ گئی تھی مگر کنکوے

بازی نہ چھوٹی۔ چھوٹتی بھی کیسے؟ ٹھاکر نواب کو بھی کنکوے بازی کا شوق تھا۔ دونوں
کے مزاج میں ناچ گانے سے زیادہ کنکوے بازی کو دخل تھا۔"(8)

شوکت صدیقی نے ناول "چار دیواری" میں لکھنو میں شادی بیاہ کی رسومات کو بھی کھل کر بیان کیا ہے۔ شادی بیاہ دو خاندانوں سمیت رشتہ داروں اور دیگر عزیزوں اقارب کے لیے خوشیوں کا ایک نادر موقع ہوتا ہے اور مغلیہ ادوار میں لکھنو میں شادی بیاہ کو ایک تہوار کی مانند منایا جاتا رہا ہے جس میں دولہا اور دلہن کی مسرت کے لیے کئی اسباب پیدا کیے جاتے رہے ہیں اور مختلف رسوم ورواج کی ادائیگی سے اس پر مسرت موقع کو چار چاند لگائے جاتے رہے ہیں۔ انھوں نے لکھنوی شادیوں میں دیئے جانے والے کھانوں کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے۔ اس میں مرغے کی یخنی، اعلیٰ قسم کے مشروبات، پان، زردہ، بونٹ پلاؤ، مٹن قورمہ وغیرہ کے نام ناول میں بکثرت سامنے لائے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے شادی بیاہ کی رسومات کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"نکاح تو چاشت کے وقت ہی ہو چکا تھا۔ برات کو کھانا بھی کھلایا جا چکا تھا۔ مگر ابھی
رخصتی نہ ہوئی تھی۔ دولہا زنان خانے میں تھا اور سالیوں کی چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنا ہوا تھا۔
طرح طرح کی رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔ سب سے پہلے دلہن کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی
کل شکری چاٹنا پڑی پھر ایک دھل پر رکھا ہوا، قرآن مجید آیا۔ دولہا دولہن کے سروں
پر چادر ڈال کر پردہ کیا گیا دونوں کے درمیان آئینہ رکھا گیا تاکہ وہ ایک دوسرے کی
شکل دیکھ لیں۔ ایک ڈومنی سر پر کھڑی دولہا کو یہ کہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بیوی
آنکھیں کھولو۔ میں تمہارا غلام دولہا سے جو کہا جا رہا تھا، کہہ رہا تھا۔ یہ آرسی مصحف کی
رسم تھی۔ اس کے بعد اسے دولہن کے پاجامے کے نیفے میں کمر بند بند ڈال کر ناز
برداری بلکہ زندگی بھر غلامی کرنے کا برملا اظہار کرنا تھا۔ یہ اور نہ جانے ایسی کتنی رسمیں
تھیں، کچھ ادا ہو چکی تھیں اور کچھ ادا ہونا باقی تھیں۔"(9)

ناول میں مختلف رسومات کے موقع پر گائے جانے والے گیتوں اور غزلیات کا ذکر بھی کثرت سے کیا گیا ہے۔ شادی کے بعد اولادِ نرینہ کے حصول کے لیے بھی مختلف رسوم ورواج لکھنوی تہذیب کا حصہ بن کر سامنے آتے ہیں جن میں ڈومنیاں ڈھولک کی تھاپ پر لہک لہک کر گانے گاتے دکھائی دیتی ہیں:

نورنگ چوڑے والیاں، میری بچارانیاں

سوہاجوڑا پہن، سہاگن موتی بھری مانگ

نورنگ چوڑے والیاں

میری بچارانیاں، ارے میری بچارانیاں(10)

ناول نگار نے لکھنوی تہذیب میں توہم پرستی، کھانے پینے، کھیل تماشوں، رنگ رلیوں طوائفوں کے اڈوں اور شادی بیاہ و دیگر تقاریب پر منعقد ہونے والی رسوم ورواج کو بیان کرنے کے ساتھ لکھنوی میں ظاہری و باطنی تضادات سے بھرپور زندگی، اخلاقی گراوٹ، اور معاشرتی جمود کو بھی بیان کیا ہے۔ لکھنو میں ایک لمبے عرصے تک یہ بات فخریہ انداز میں بتائی جاتی رہی ہے کہ مجرا اور طوائف کا کوٹھا شرفا کی اولاد کی تربیت کے لیے گہوارے کا کام کرتا رہا ہے۔ لکھنو میں نواب زادوں کو تربیت فراہم کرنے اور زندگی کے آداب سکھانے کے لیے طوائف خانوں میں بھیجا جاتا رہا ہے جہاں طوائفیں انھیں زندگی کے آداب سکھاتی رہی ہیں۔ یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ ناول نگار نے لکھنوی تمدن کے مذکورہ بالا پہلوؤ کو قابلِ فخر انداز میں پیش کرنے کے بجائے اس پر نوحہ خوانی کی ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل اقتباس لکھنوی تہذیب کے اس رنگ کو واضح کر دیتا ہے:

> ”خسرو کے رخسار پر طوائف کے لبوں سے پان کی ہلکی سی پیک لگ گئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے آہستہ آہستہ اسے پونچھتا رہا، رقص دیکھتا رہا، گانا سنتا رہا۔ وہ کافر ادا محفلِ طرب سے رخصت ہوئی، دوسری طوائف آئی، اس نے تبلے کی تھاپ اور سارنگی کے سُر سے سُر ملا کر ایک غزل چھیڑی۔ اشعار سن کر خسرو کے ذہن میں تجسس پیدا ہوا۔ باپ کو مخاطب کیا۔ ابا حضور! یہ عشق کی بیماری کون سی بیماری ہوتی ہے۔ بخار آتا ہو گا جیسا شکورن کو آتا تھا۔ نواب ساحب نے مسکرا کر خسرو کو دیکھا مگر خاموش رہے، موسیقی سے لطف اندوز ہوتے رہے لیکن خسرو خاموش نہ رہا۔ کبھی پوچھتا، یہ سینوں کے تیر کیسے چلائے جاتے ہیں؟ کبھی دریافت کرتا، یہ نگاہوں کے خنجر سے قتل کیسے کیا جاتا ہے؟ نواب صاحب کچھ کہنے بھی نہ پائے کہ قریب بیٹھے ہوئے ان کے مصاحب خاص،

نوابو مرزا، فورًا چہک کر خسرو کے ہر سوال پر داد دیتے، ارے سبحان اللہ، کیا ذہنی جودت ہے، چشم بد دور۔ اس سن میں چھوٹے سرکار کیا دماغ سے اتار اتار کر باتیں کرتے ہیں واللہ، کیا اپج ہے وہ نواب تقی کی خوشنودی طبع کی خاطر نہایت مستعدی سے اپنی کار گزاری دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجرا ختم ہو گیا، لیکن خسرو کے سوالات کا سلسلہ بند نہ ہوا، پوچھا، ابا حضور! یہ شبِ وصل کیا ہوتی ہے؟ نواب صاحب خاموش رہے۔"(11)

ناول نگار نے مذکورہ ناول میں لکھنوی تہذیب کے اندر موجود خرابیوں اور کوتاہ بینیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ یہ ناول ایک طرح سے سلطنت اودھ کے مرکزی شہر لکھنو کے انہلام یا زوال کا نوحہ ہے جس میں کئی خرابیاں ہیں۔ انھوں نے ناول میں اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ جس شام اودھ کہا جاتا ہے، وہ حکیموں کے مجرب نسخوں اور کشتوں، ہندو بنیے کے تمسکات، توہمات کو اجاگر کرنے کی صلاحیت، جاہلانہ رسوم و رواج، مصاحبین کی میلہ گری اور جعل سازوں کی ہنر مندی کا بھی کرشمہ تھا۔ اسی طرح ناول میں لکھنوی بیگمات کا ذکر انھوں نے کمال مہارت سے کیا ہے۔ ناول میں لکھنوی بیگمات کی زندگی اور تمدن کو انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"لیکن اس ناول کی حقیقی معنویت یہ ہے کہ ایک چار دیواری کے اندر رہنے والی لکھنوی بیگمات کے پاس عام طور پر جسم ہیں۔ بے حد خوبصورت اور آسودگی دینے والے، زبان ہے آراستہ نزاکت اور نفاست سے معمور، اپنے حریفوں کو زچ کرنے والی معلومات یا خبر کے ذرائع ہے اور تدبیریں ہیں مگر ایک محدود دنیا کا تجربہ انھیں سادہ لوح بنائے ہوئے ہے جبھی ان کی سادہ لوہی سے فائدہ اٹھانے والے بہت سے لوگ آسانی سے جنات کا روپ دھار لیتے ہیں اور انہی میں سے کچھ جن اتارنے والے بن جاتے ہیں۔ سونوابی کلچر کے عورت مرد آسیب کے متعلق العنانی کے آگے اس طرح سے زمین بوس ہو جاتے ہیں کہ سمجھ میں آتا ہے کہ بعض معاشرے ایک خاص سطح پر علوم اور فنون کی ترقی پر نازاں بھی ہوتے ہیں مگر تاریخی شعور کو درکنار اپنے سماج میں وقوع پزیر ہونے والی تبدیلیوں کا انہیں احساس بھی نہیں ہوتا۔"(12)

ناول میں شوکت صدیقی نے لکھنوی تہذیب میں برپا ہونے والے انقلاب اور لکھنوی معاشرت میں آنے والی تبدیلیوں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ اپنے مخصوص تہذیبی پس منظر میں لکھنو ہمیں اس ناول میں مستند تاریخی حوالوں اور واقعات اور تاریخی کرداروں کے حوالے سے اپنی بھرپور شناخت کراتا ہے۔ یہ اس لکھنو کی کہانی ہے جہاں طاقوں میں چراغ روشن روشن ہوتے ہیں۔ چھتوں میں گیس کے ہنڈے لٹکتے تھے اور جب ناول اختتام کو پہنچتا ہے تو لکھنو میں بجلی کی روشنی آچکی ہوتی ہے۔ چائے کی پبلسٹی شروع ہو چکی ہوتی ہے۔ لوگ ایک نئے مشروب اور ذائقے سے آشنا ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ ناول میں ہمیں قدیم اور موجودہ لکھنو کے جغرافیہ سے بھی متعارف کراتا ہے اور جو تبدیلیاں رونما ہوئی، وہ بھی اس ناول کا حصہ بنتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ قدیم لکھنو کی بعض انوکھی اور حیران کن رسموں سے قارئین پہلی بار آشنا ہوئے ہیں۔ دوسرے ان رسموں میں مذہب اور رباب کو جوڑنے کا تخلیقی عمل بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ میر تقی میر کی قبر پر ریل کی پٹری کا بننا بھی لکھنوی شان و شوکت اور لکھنو کی مخصوص تہذیبی فضا کے زوال کا نوحہ ہے جس کا ذکر شوکت صدیقی نے ناول کے آخر میں کیا ہے:

> "پل کے دائیں جانب نیم کے درختوں کا جھنڈ تھا جس پر کوؤں کا غول شور مچاتا ہوا منڈلا رہا تھا۔ درختوں کے نیچے مختصر سا قبرستان تھا۔ انہی قبروں میں میر تقی میر کی قبر بھی شامل تھی۔۔۔ اب ان کی قبر کے سرہانے ریل گاڑیاں، لوہے کی پٹریوں پر دن رات شور مچاتی، چھنگاڑتی، دھڑ دھڑ کرتی گزرتی تھیں۔ قبر پر کسی نے مدت سے چراغ بھی روشن نہیں کیا تھا۔ یہ بھی صحیح طور پر علم نہ تھا کہ ان قبروں میں میر تقی میر کی قبر کون سی ہے۔ کتنی ہی قبریں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈروں کی علامت بن چکی تھیں۔"(13)

ناول میں مغلیہ دور میں لکھنوی معاشرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی دور میں لکھنوی تہذیب میں آنے والی تبدیلیوں اور نو آبادیاتی عہد میں لکھنو کے تمدن کو بھی کمال مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ساری عمر عیش و عشرت میں زندگی گزارنے والے لکھنوی نواب اور بیگمات اور زندگی کو طرب گاہ تصور کرنے والے لکھنوی آمرانو آبادیاتی نظام میں جس کسمپرسی کا شکار ہوئے، وہ لکھنوی تہذیب و تاریخ کا حصہ بھی ہے اور لکھنوی تاریخ المناک باب بھی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پورے ہندوستان کے ساتھ ساتھ سلطنت اودھ کے مرکزی شہر لکھنو میں بھی مسلمان مصاحبین اور نواب زادوں کو مسرت کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ مسلمانوں سے ان کی جائیدادیں اور املاک چھین لی گئی، انھیں خراج وصول کرنے سے روک دیا گیا اور اعلیٰ عہدوں سے انھیں سبکدوش کر کے انھیں مختلف مقدمات میں الجھا دیا

گیا۔ اسی طرح عام مسلمانوں کی زندگی بھی اجیرن کر دی گئی جس سے لکھنو میں رنگ و مستی اور عیش و عشرت والی زندگی معدوم ہوتی گئی اور نو آبادیاتی نظام اور اس سے جڑے حقائق لکھنوی تہذیب کا حصہ بنتے گئے۔ لکھنو میں برطانوی راج کے بعد آنے والی تبدیلیوں کو ناول نگار نے اس اقتباس میں یوں بیان کیا ہے:

> "تانگہ جب میڈیکل کالج سے آگے بڑھا اور شاہ مینا مخدوم کی درگاہ کے سامنے پہنچا تو اچانک زبردست دھماکہ ہوا۔ ایک بم تانگے پر آپھٹا۔ خسرو کے دونوں ہم نشین اور تانگے والا تو زخمی ہو کر ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوئے لیکن خسرو کا جسم اس بری طرح جھلسا کہ تانگے ہی میں دم توڑ دیا۔ عین اسی وقت سڑک پر انگریز ڈپٹی کمشنر کی موٹر بھی گزری تھی۔ کہتے ہیں کہ بم دراصل اسی پر ہی پھینکا تھا۔ لیکن نشانہ چوک گیا۔ اخبارات نے بھی اسی شے کا اظہار کیا تھا۔ انھی دنوں کئی شہروں میں بموں کے دھماکے ہو چکے تھے جن میں کئی افراد ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ حکومت نے ان دھماکوں کا ذمہ دار دہشت پسندوں کی تنظیم، ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کو قرار دیا تھا۔"(14)

شوکت صدیقی کے ناول میں لکھنوی تہذیب کے زوال کو ناول نگار نے جس سلیقے سے پیش کیا ہے، اس کو ڈاکٹر محمد حنیف فوق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "چار دیواری میں اودھ کی تہذیب کو اس کے انداز و فکر نظر اور زوال آمادہ خصوصیات کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قصے کی پر اسراریت اور سوچ کے دائرے مل کر اک دل نشین نقش بناتے ہیں۔ کردار نہ صرف اس ماحول بلکہ تہذیبی خصوصیات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس ماحول کا لازمی جزو معلوم ہوتے ہیں۔"(15)

مجموعی طور سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ شوکت صدیقی نے کمال مہارت سے اپنے ناول بعنوان "چار دیواری" میں لکھنو کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے لکھنوی تہذیب کی خوبیوں اور خصائص کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنوی تہذیب میں موجود منفی پہلوؤں کو بھی بھرپور طریقے سے اجاگر کیا گیا ہے۔

## حوالہ جات


1۔ انوار احمد، ڈاکٹر، شوکت صدیقی: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص:۱۱

2۔ شوکت صدیقی، چار دیواری، نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص:39-38

3۔ رضوانہ سید علی، چار دیواری از شوکت صدیقی کے نسبتاً کم معروف ناول پر ایک نظر (مضمون)، مشمولہ: ادبیات، سہ ماہی ادبی جریدہ، ناول نمبر (جلد اول)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، شمارہ نمبر ۲۲۱۔۱۲۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء، مدیر: اختر رضا سلیمی، ص:438

4۔ شوکت صدیقی، چار دیواری، ایضاً، ص:13-12

5۔ ایضاً، ص:758

6۔ ایضاً، ص:15-14

7۔ ایضاً، ص:30-29

8۔ ایضاً، ص:۹

9۔ ایضاً، ص:21

10۔ ایضاً، ص:155

11۔ ایضاً، ص:144

12۔ انوار احمد، ڈاکٹر، شوکت صدیقی: شخصیت اور فن، ایضاً، ص:29

13۔ شوکت صدیقی، چار دیواری، ایضاً، ص:264

14۔ ایضاً، ص:172

15۔ محمد حنیف فوق، ڈاکٹر، شوکت صدیقی۔ ایک مطالعہ (مضمون)، مشمولہ: قومی زبان، ماہنامہ ادبی جریدہ، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۱۱ء، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ص:51